ایک چراغ جو گل کر دیا گیا

ڈاکٹر مشیر الحق ندوی مرحوم

(۱)

پیدائش : ۱۹۳۳ء-۱۳۵۳ھ بحری آباد غازی پور

وفات : ۱۰/ اپریل ۱۹۹۰ء ۱۳/ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ سری نگر، کشمیر

مشیر صاحب بڑے خوش قسمت ثابت ہوئے، اپنے ہم عصروں اور ہم چشموں میں نمایاں امتیاز حاصل کیا۔ علم، عزت، عہدہ نام وری، نیک نامی میں آگے سے آگے نکلتے گئے۔ اور جب وقت موعود آگیا تو خالی ہاتھ نہیں گئے، ربّ کائنات کی سرکار میں اپنی مظلومیت اور بے گناہی کا پروانہ لے کر گئے۔

دینے والے کی شان بھی نرالی شان ہے، دینے پر آتے ہیں تو دیتے ہی چلے جاتے ہیں۔ لینے والے کا ایک کاسہ بھر جاتا ہے، تو دوسرا کاسہ تھما دیتے ہیں۔

کون تصور کر سکتا تھا کہ مشیر صاحب جیسا بے ضرر، شریف النفس انسان گولیوں کا نشانہ بنایا جائے گا۔ اور اس طرح پروفیسر مشیر الحق شہید مشیر الحق بن جائیں گے۔ دنیا کی نعمت و سرفرازی تو سب دیکھ رہے تھے۔ مگر آخرت کے لیے بخشائش و قبولیت کا منظر کس نے دیکھا تھا، اور کون دیکھ سکتا تھا۔ مگر جس بات کا تصور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی تصدیق ہوگئی۔

جمعہ ۶/ اپریل ۱۹۹۰ء مکہ مکرمہ میں گیارہواں روزہ تھا۔ دہلی کسی کام سے فون کیا، بات ختم ہوئی تو پوچھا "اور کوئی خاص بات" ادھر سے بھرائی ہوئی آواز میں جواب ملا، معلوم ہوا کہ "مشیر الحق صاحب کو کشمیریوں نے کِڈ نیپ کر دیا ہے" تشویش اور فکرمندی تو قدرتی بات تھی، مگر حوادث کو دل

جلدی تسلیم نہیں کرتا۔ کوئی دور سے بھی ایک تنکے کا سہارا مل جائے تو اس کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ سوچا ایسا کہاں ہوگا کہ یہ کشمیری مسلمان، ایک مسلمان اور باعزت انسان سرتاپا بے گناہ کو ہلاک کر دیں گے، ابھی اس واقعہ کو سال بھی نہیں ہوا کہ اسی کشمیر میں ایک طالب علم خاتون کا اغوا کیا گیا تھا۔ کئی روز تک اخبارات میں گہما گہمی رہی۔ پھر معلوم ہوا موصوفہ واپس کر دی گئیں۔ ان کی خاطر پانچ قیدیوں کو نہ صرف رہا کیا گیا بلکہ ان کی مطلوبہ جگہ تک پہنچا دیا گیا۔ پھر ٹیلی ویژن پر وہ منظر بھی دکھایا گیا کہ وزیر داخلہ سنہرے لڈوؤں کی تھال لیے اپنے آقا (وزیر اعظم) کے حضور میں ہیں۔ غرض ایک طالبہ کے لیے پانچ قیدی چھوڑے جا سکتے ہیں تو کیا ایک ہر دل عزیز وائس چانسلر کے لیے ایک قیدی نہیں چھوڑا جا سکتا۔ یہ بات سمجھ سے دور نہیں نزدیک تھی۔ خیال تھا اور اس خیال کو دل کی طلب مجسم کر رہی تھی، کہ یہ ڈرامہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اور ایسا کیا اندھیر ہوگا کہ مسلمان کشمیری ایک پابند صوم وصلاۃ شریف النفس، شریف سیرت، شریف صورت، بے ضرر مسلمان کو قتل کر دیں گے؟ اور حکومتِ ہند کچھ تو اس کی شرم رکھے گی کہ وائس چانسلر مشیر الحق اس کی آبرو کا نشان تھے۔ اور وزیر داخلہ جو ایک باپ کا دل سینے میں رکھتے ہیں۔ اپنی صاحبزادی کے لیے اپنے خاندان کی بے قراری دیکھ چکے ہیں، کیا ایک قیدی کا فدیہ دے کر ایک اہم شخصیت کو بچانے کی کوشش نہیں کریں گے؟ مگر ۱۲ اپریل کی صبح کو عرب نیوز (۱) میں یہ خبر پڑھی کہ اغواء کرنے والوں نے تین میں سے ایک صنعت کار کھیرا (یا اسی طرح کا کوئی نام تھا) کو ہلاک کر دیا۔ شام کو میرے عزیز احمد ندیم نے بڑی افسردہ آواز میں خبر دی کہ چچا مشیر کو گولی مار دی گئی، ابھی بی بی سی نے بتایا ہے۔

زبان پر بے ساختہ آیا آج حکمراں پارٹی نے اپنی آن پر ایک بے گناہ و مظلوم کو قربان کر دیا۔ ایک روشن چراغ تھا جس کو زبردستی گل کر دیا گیا۔ معلوم نہیں مشیر صاحب کی بیوی بچیوں کو کیسے اس کی خبر دی گئی ہوگی۔ جب برق تڑپ کر ٹوٹی ہوگی اس وقت کا عالم کیا

---

(۱) جدہ کا انگریزی روزنامہ جو ہندوستان کی کانگریس اور پاکستان کی پیپلز پارٹی کا اخبار سمجھا جاتا ہے ہندی پاکستانی حلقوں میں بھی اخبار پڑھا جاتا ہے۔ کیوں کہ عربی سے یہ لوگ واقف نہیں سفارت خانوں کے لیے بھی یہی ذریعۂ معلومات ہے۔

ہوگا؟ ادھر پچاس سال کا عرصہ تصویروں کے ایک البم کی طرح نگاہوں کے سامنے چمکنے لگا۔

مشیر الحق صاحب، غالباً ۱۹۴۱ء میں حافظ مجیب اللہ صاحب (مؤسس و ناظم جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ) کے ساتھ ان کے برادر خورد کی حیثیت سے ندوہ میں داخل (۱) ہوئے اور بڑے طلبہ کی اقامت گاہ میں رہنے لگے۔ یہ بھی یاد نہیں کہ کس درجہ تک انھوں نے پڑھا، پھر وہ ادارۂ تعلیمات اسلام امین آباد میں منتقل ہوگئے، کئی سال وہاں رہے اور اس عرصہ میں انھوں نے ہائی اسکول پاس کیا، کچھ دن کے لیے پاکستان بھی گئے مگر جب پاسپورٹ کی پابندی ہوگئی تو چلے آئے، ان کے بھائی اب بھی وہاں موجود ہیں۔

ادارۂ تعلیمات اسلام کے مؤسس و روحِ رواں استاذ گرامی مولانا عبدالسلام قدوائیؒ تھے۔ مولانا کا تقرر جامعہ ملیہ میں ناظم دینیات کی حیثیت سے ہوگیا۔ ان کے جاری کردہ پندرہ روزہ "تعمیر" کی ادارت مشیر صاحب کرتے رہے پھر کچھ دنوں بعد مشیر صاحب جامعہ چلے گئے اور جامعہ ہی کے ہوکر رہ گئے۔ وہاں غالباً بی اے۔ ایم اے کرنے کے بعد مونٹیال میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے ایک اسکالرشپ مل گیا۔ وہاں سے واپسی کے بعد کلرکی اور شیخ الجامعہ کے پی اے کے درجے سے ترقی کرکے لکچرر مقرر ہوئے۔ ترقی کرکے صدر شعبہ اسلامیات تک پہنچے۔ کئی سیمیناروں میں شرکت کے لیے یوروپ و امریکہ جاتے رہے، کامیابی ہر گام پر قدم چومتی رہی۔ غیر جانب دار ملنسار، خوش مزاج اور توازن دل و دماغ، تنظیمی صلاحیت کے مالک تھے، لوگوں کا اندازہ تھا کہ جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر ہونے کے لیے ان کا راستہ ہموار ہے مگر اس سے پہلے کہ جامعہ میں جگہ خالی ہو کشمیر یونی ورسٹی کی طرف سے دعوت آگئی۔

مجھ سے ملاقاتیں کم ہوتی تھیں مگر سال دو سال میں جب بھی ملنا ہوا مشیر صاحب کو وہی مشیر الحق پایا جو ادارۂ تعلیمات اسلام میں تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ملاقات سالوں اور برسوں کے بعد نہیں بلکہ مسلسل ہوتی رہی ہے، بغیر کسی تحفظ (Reservetion)

---

(۱) موصوف سے مشیر صاحب کا کوئی رشتہ نہیں تھا، یہ محض ایک انتظامی تدبیر تھی کہ ایک یتیم کسی کی گارجین شپ میں رہے یہ بات عرصہ کے بعد خود مشیر صاحب نے مجھے بتائی۔

کے اس سادگی اور سچائی سے ملے جس طرح پہلے روز ملے تھے۔

مجھے یہ نہیں معلوم کہ مشیر الحق صاحب سید تھے، شیخ تھے، پٹھان تھے، کیا تھے۔ ان کا خاندانی شجرہ کیا تھا۔ مگر جو بات ان کی پیشانی پر ابھری ہوئی نظر آتی تھی، وہ یہ کہ کسی بڑے عالی خاندان کے فرد تھے۔ امام شافعیؒ کے عربی کے دو شعر میں ان کا مفہوم ہے کہ:

"پردیس میں کوئی نہیں جانتا کہ تم کس خاندان کے فرد ہو۔ مگر تمہارا اخلاق اعلان کردے گا کہ تم کس طبقہ سے تعلق رکھتے ہو۔"

مشیر صاحب کو اس وقت بھی دیکھا جب ندوہ میں مرے ایک ہم درس طالب علم کے برادر خورد تھے، پھر ادارۂ تعلیمات اسلام میں مولانا قدوائیؒ کے عربی زبان کے دس سبق پڑھاتے تھے، جامعہ میں جونیئر کلرک تھے، پھر ڈاکٹر اور پروفیسر ہوئے، وائس چانسلر ہوئے، آخری ملاقات ۱۹۸۹ء کے نومبر میں ہوئی۔ مرحوم سید صباح الدین صاحبؒ پر ایک روزہ سیمینار تھا، جس کے افتتاحی جلسہ کی صدارت کے لیے آئے تھے، راقم کو مقالہ بھی پڑھنا تھا۔ اور مخدوم ومربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا افتتاحی خطبہ بھی سنانا تھا۔ ملاقات اسی طرح ہوئی جس میں رکھ رکھاؤ، تصنع، ظاہرداری کو دور کا بھی دخل نہیں تھا۔ ان سے مکہ میں بھی ملاقات ہوئی اور کشمیر میں ان کی وائس چانسلری کے دور میں بھی ملاقات ہوئی، وہ اپنی سرکاری حیثیت کے مطابق ایک بڑی کوٹھی میں رہتے تھے۔ دروازوں پر پہرہ دار بندوق لیے حفاظت کرتے تھے۔ ندوہ بھی آتے رہتے تھے۔ ان کے ایک بہنوئی شاہ ابوالقاسم صاحب وہاں مدرسہ ثانویہ میں استاد تھے۔ ان کے ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی ایک سیمینار میں آئے، اس وقت وہ وائس چانسلر ہو چکے تھے۔ میں نے کہا مجھے یہاں آنے کے بعد آپ کے ہی عہدہ کی خبر ملی، ارادہ کرتا ہی رہ گیا کہ آپ کو مبارک باد کا خط لکھوں۔ آج بالمشافہ یہ مبارک باد دینا چاہتا ہوں۔ کہنے لگے ابھی نہیں، ابھی اپنی مبارک باد محفوظ رکھئے۔ جب وہاں سے اپنا ٹرم پورا کر کے کامیاب واپس آجاؤں تو مبارک باد دیجئے گا۔ کس کو معلوم تھا کہ ان کی زبان سے کاتب تقدیر یہ الفاظ نکلوا رہا تھا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے کہا

تھا کشمیر تو بڑے امن کی جگہ ہے۔ لکھنؤ یونی ورسٹی یا جامعہ ملیہ کی طرح شورش پسند طلبہ وہاں نہیں رہتے۔ اس پر مشیر صاحب نے بتایا کہ فتنوں سے کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ پھر ایک واقعہ بتایا کہ اچانک کسی کتاب کے سلسلہ میں احتجاج کرنے والے ان کے آفس کے باہر جمع ہو گئے تھے جس کو انھوں نے حسنِ تدبیر سے رفع دفع کیا۔

نصف صدی کا عرصہ گزرا، کسی ایک شخص کو ایسا نہیں پایا جو مشیر صاحب سے شکوہ سنج ہو۔ اگر کسی نے دل کھول کر تعریف نہیں کی تو کسی نے آج تک ایک حرف برائی کا بھی نہیں کیا۔

انھوں نے ترقی کی اور ایسی ترقی کی کہ ہزاروں کے لیے باعثِ رشک تھی، وہ پچھلی صف سے اٹھے اور اپنا راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ آگے بڑھنے کے لیے انھوں نے کسی کا سہارا نہیں لیا۔ کوئی بڑی شخصیت ان کی سفارشی نہیں تھی۔ کسی کا حق نہیں مارا، کسی کو دھکا دے کر آگے نہیں بڑھے۔ اپنی متوازی چال سے، سمجھ بوجھ سے، کھلے دل و دماغ سے صحیح راستے پر گامزن رہے۔ اپنی ترقی کے لیے دوسروں سے سیڑھی مستعار نہیں لی، بلکہ وہ سیڑھی بھی خود تیار کی تھی۔

بارالہٰا! تیرے گنہگار بندے یہ شہادت دیتے ہیں کہ یہ تیرا ناچیز بندہ مشیر الحق مظلوم و بے گناہ مارا گیا ہے۔ اپنی رحمت سے اس کے خون کی لاج رکھ لے اور دنیا میں جس طرح تو نے اس کو سرفراز کیا تھا۔ آج اس سے ہزار گنا زیادہ اپنی رحمتوں سے لطف کا معاملہ فرما، اور ان کی ہڈیوں کو پھولوں میں رکھ۔ مشیر الحق تم اس سفر میں تنہا نہیں ہو، صرف تمھاری بیوی، اور بچیوں کا نالۂ بے تاب تمھارے ساتھ نہیں ہے، بلکہ سیکڑوں دلوں کی دھڑکنیں تمھارے ساتھ ہیں۔ ہزاروں احباب کے آنسو تمھارے چھلنی کیے جانے والے جسم کے زخموں کو دھو رہے ہیں۔

تم دنیا و آخرت دونوں جگہ کامیاب رہے۔ تمھاری شخصیت مقامی تھی، پھر زندگی ہی میں ملک گیر ہو گئی اور موت اس طرح آئی کہ تم بین الاقوامی عزت کے مستحق بن گئے۔

طوبیٰ لك حیًّا و میّتًا. (۱)

---

(۱) یہ مضمون تعمیر حیات لکھنؤ شمارہ ۲۵ رمئی ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ (مرتب)

(۲)

رفتید و لے نہ از دلِ ما

مشیر صاحب کا جب حادثۂ شہادت پیش آیا، اس وقت قلب و دماغ پر صدمے کا گہرا اثر تھا۔ اس وقت جو لکھا وہ ایک محبّ، مخلص کی یاد میں ٹپکے ہوئے آنسو تھے مگر مشیر صاحب کا حق مجھ پر اس سے زیادہ تھا اور ہے اور جب تک زندہ ہوں باقی رہے گا۔

ندوہ کے شبلی دارالاقامہ (یا شبلی ہوسٹل جیسا کہ اس زمانے میں لوگوں کی زبان پر تھا) میں وہ ایک کم عمر طالب علم کی حیثیت سے تھے اور اپنے ایک منہ بولے بھائی کی نگرانی میں تھے اس وقت نہ ان سے خلا ملا تھا نہ ان کے "برادرِ خورد" سے زیادہ ان کی اہمیت تھی۔ ندوہ سے نکلنے کے بعد استاذ مرحوم مولانا عبدالسلام قدوائیؒ نے امین آباد میں "ادارہ تعلیمات اسلام" کا مرکز قائم کیا تھا جس میں ان کے اوّلین رفقاء میں مولانا عبدالغفار صاحب ندویؒ جو اب جماعت اسلامی کے اہم رکن ہیں اور لکھنؤ شاخ کے ذمہ دار بھی عرصہ سے ہیں۔ دوسرے علی احمد صاحب (کیانی) مرحوم تھے بعد میں کچھ دنوں کے لیے میں بھی شریک ہو گیا۔ ان کے بعد ایک اور کھیپ مولانا کی معاون بنی۔ ان میں صلاح الدین صاحب (جو اَب پاکستان میں ہیں) مشیر الحق بحری آبادی اور احتشام علی صاحب رحیم آبادی نمایاں تھے۔ مولانا نے "عربی زبان کے دس سبق" اس نرالے انداز میں مرتب کیے کہ ان کا یہ چند ورقی رسالہ ان کی مستقل تصنیفات سے زیادہ مقبول ہوا اور اسی طرز پر قرآن کی پہلی کتاب قرآن کی دوسری کتاب مرتب کی۔ ایک حلقہ بالغ طالب علموں کا جمع ہو گیا، ہر ہفتہ قرآن کریم کا درس عام ہونے لگا اور ایک پرچہ "تعمیر" ہفتہ وار نکلنا شروع ہوا جس کے ایڈیٹر کی حیثیت سے نام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ اور مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی علیہ

الرحمہ کا تھا۔ روزانہ عربی پڑھنے والوں کے حلقے بن گئے۔ خط وکتابت سے عربی پڑھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ مشیر صاحب کا رجحان تدریس اور تنظیم کے بجائے صحافت کی طرف تھا اور جب مولانا عبدالسلام قدوائیؒ جامعہ ملیہ چلے گئے تو ''تعمیر'' کی تمام تر ذمہ داری مشیر الحق بحری آبادی پر آ گئی۔ ان کو لکھنے لکھانے کا ذوق تھا۔ اس ذوق کو جلا دینے کے لیے ''غنچہ'' بجنور میں مستقل لکھا کرتے تھے۔ یہ رسالہ دراصل بچوں کا تھا مگر بہت سنجیدہ اور ادب آموز، اخلاقی ودینی مضامین سے مزین رہتا تھا، اس کے ٹائیٹل پر اسلام اور دین کی خدمت کا اعلان نہیں تھا مگر وہ اخلاقی ودینی ہی قسم کا پرچہ تھا۔ بچوں کے ذہن کو اخلاقیات کے سانچے میں ڈھالنے میں اس کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ راقم الحروف نے کبھی کوئی مضمون تو نہیں لکھا مگر عرصہ تک پابندی سے پڑھتا رہا ہے۔ مشیر صاحب کی ابتدائی نوجوانی کے مضامین اس میں بکثرت شائع ہوئے ہیں۔ اگر ان کو جمع کردیا جائے تو ایک گلدستۂ مضامین برائے نسلِ نو تیار ہوسکتا ہے۔ رسالہ تعمیر میں مشیر صاحب لکھتے تھے اور بعد میں تو ایسا ہوگیا کہ ایڈیٹر کی حیثیت سے نام صرف حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا تھا مگر اس کے ایڈیٹر، مدیر، منتظم سب کچھ مشیر صاحب تنہا تھے۔ ادارہ تعلیمات اسلام (امین آباد لکھنؤ) کے فلیٹ میں مشیر صاحب ایک عرصہ تک مکمل ذمہ دار اور عملاً ''تعمیر'' کے ایڈیٹر رہے اور یہیں رہ کر انھوں نے پرائیویٹ ہائی اسکول کا امتحان تمام مضامین میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ میں اس زمانے میں ندوہ میں مدرس تھا۔ مشیر صاحب کی شادی بھی اسی زمانہ میں ہوئی اور کچھ عرصہ ادارہ سے متصل ہی کسی فلیٹ میں اپنی والدہ صاحبہ اور بیگم کے ساتھ مقیم رہے۔ یہاں ان کی سوانح کی ایک کڑی مجھے نہیں مل رہی ہے کیوں کہ میں حجاز چلا گیا تھا اور وہاں سے ڈیڑھ سال بعد دارالعلوم اپنی تدریسی خدمات پر واپس آیا۔ اس ڈیڑھ سال کے عرصہ میں ادارہ تعلیمات اسلام بند ہوچکا تھا اور مشیر صاحب جامعہ ملیہ جاچکے تھے، اتنا معلوم ہوا کہ وہاں سے انھوں نے گریجویشن کیا۔ علی گڑھ سے ایم اے کیا اور وہاں ان کو کوئی عہدہ مل گیا ہے۔ جب میں

دوبارہ ۱۹۶۴ء میں حجاز گیا۔ اس دوران وہ مانٹریال (کنیڈا) جاچکے تھے۔ جہاں سے انھوں نے ہندوستانی ثقافت کے کسی موضوع پر پی ایچ ڈی کیا۔ مانٹریال میں ان کے ساتھیوں میں پروفیسر ظفر اسحاق صاحب بھی تھے جو اَب عالمی اسلامی یونی ورسٹی (اسلام آباد) میں پروفیسر ہیں۔ ظفر اسحٰق صاحب انگریزی کے ایک تسلیم شدہ انشاء پرداز ہیں اور انھوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ترجمۂ قرآن کو انگریزی میں منتقل کیا ہے۔ ظفر اسحاق صاحب مشیر صاحب کے سلامت روی، محنت اور خلوص کے قائل ہیں، اور مجھ سے ان کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کرتے تھے۔

پھر عرصہ گزر گیا بلکہ ایک عمر بیت گئی، ہم ایک دوسرے سے دور رہے مگر یہ دوری جسمانی تھی، ذہنی تعلق قائم رہا۔ اچانک مکہ مکرمہ میں مجھے ان کا خط ملا کہ میں لندن سے واپسی میں مکہ مکرمہ عمرہ کے لیے آرہا ہوں مگر تاریخ نہیں لکھی وہ مکہ مکرمہ میں میرا سراغ مشکل سے لگا سکے، ایک عرصہ کے بعد ہم دونوں یکجا ہوئے ایک عمر کی کہانی ایک نے دوسرے کو سنائی۔ دو راتیں اور تین دن وہ میرے مہمان رہے اس کے بعد پھر خط وکتابت کا سلسلہ چل پڑا مگر پابندی سے نہیں، کبھی کبھار صرف اتنا ہوا کہ ایک دوسرے سے بے خبر نہیں رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے مسلمانانِ ہند اور سیکولرزم پر ایک کتاب لکھ ڈالی جو مجھے پسند نہیں آئی، میں نے ذاتی خط میں اس پر سخت تنقید کی زبانی معلوم ہوا کہ انھوں نے میری تنقید کا نمبروار جواب لکھ بھیجا تھا جو مجھے نہ مل سکا، وہاں ان کے مقالے (پیپرس) جو انھوں نے سمیناروں میں پڑھے تھے، وہ سب جاندار تھے۔

مشیر صاحب جامعہ ملیہ میں اسلامک اسٹڈیز کے صدر تھے۔ میں ام القریٰ یونیورسٹی میں عربی کا استاذ تھا۔ درمیان میں ایک بار آنا ہوا تو ان کے شعبہ کے ایک لائق ندوی استاذ شفیق احمد خاں صاحب (۱) نے مجھے ایک لکچر کی دعوت دی جو مشیر صاحب کی سرکردگی میں دیا گیا۔

جامعہ کے حلقہ میں یہ بات سنی جارہی تھی کہ جامعہ کے آئندہ شیخ الجامعہ مشیر الحق صاحب ہوں گے۔ پھر پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی سے معلوم ہوا کہ مشیر صاحب کشمیر یونیورسٹی کے

(۱) پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد خاں ندوی سابق صدر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ورکن مجلس انتظامی ندوۃ العلماء۔ (م)

وائس چانسلر ہو گئے، اپنی وائس چانسلری کے زمانہ میں رابطہ ادب اسلامی کے ایک اجلاس میں شرکت کے لیے وہ لکھنؤ آئے، ندوہ آئے تو اپنے پرانے ساتھیوں سے بھی ملے جن میں بھی تھا لوگوں سے سنا کہ وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی آرہے ہیں، مگر جب اپنی رہائش گاہ پر قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ مشیر الحق بحری آبادی ہی ہیں، مزاج وافتاد چال ڈھال گفتگو اور بے تکلفی میں کہیں سے وہ ''آنر یبل'' نہیں دکھائی دیے یہی اخلاقی جوہر ہے جو اُن کا امتیازی وصف تھا اور جس کے متعلق میں اپنی ایک تحریر میں لکھ چکا ہوں کہ ان کی اخلاقی بلندی یہ بھی بتاتی ہے کہ وہ ایک اونچے شریف گھرانے کے شریف انسان تھے۔

انسان پیدا ہوتے ہیں انسان مرتے ہیں، حوادث کا شکار بھی انسان ہی ہوتے ہیں، مرور ایام سے ہر غم مِٹ جاتا ہے، ہر زخم مندمل ہو جاتا ہے۔ پھر ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ لوگ جانے والوں کو بھول جاتے ہیں مگر اخلاقی بلندی، کردار کی عظمت اور شرافت نفس وہ اوصاف بن جاتے ہیں کہ جن کو موت نہیں آتی، وہ ہمیشہ پائندہ اور تابندہ رہتے ہیں۔

مشیر الحق صاحب نے زندگی کی ابتدا صفر سے کی تھی اور ترقی کی دوڑ میں اپنے تمام ہم عمروں اور معاصروں سے آگے بڑھ گئے، انھوں نے اونچے ہونے کے لیے کسی کاندھے کا سہارا نہیں لیا بلکہ وہ سیڑھی بھی خود ہی بنائی جس سے وہ اوپر کی منزلوں پر چڑھے، یہ بھی سنا ہے اور سچ سنا ہے کہ انھوں نے اپنے متعدد دوستوں اور ساتھیوں کو آگے بڑھانے میں کافی معاونت کی۔

عقائد کے لحاظ سے کسی خاص گوشہ کی طرف ان کا رجحان نہیں تھا ایک سیدھے سادے قصباتی مسلمان کی طرح اسلامی عقائد رکھتے تھے۔ سیکولرزم وغیرہ تو ایک سیاسی رجحان ہے اور فیشن بھی ہے، میں نے ان کو ہمیشہ نماز روزہ کا پابند دیکھا۔ سچا، کھرا، مخلص، دوست نواز، محسن طبع انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ کی نوازش بے پایاں نے ان کو شہادت کا درجہ دیا جو ایک مسلمان کے لیے بڑی سرفرازی ہے، اللہ ان کی ہڈیوں کو پھولوں میں رکھے۔ آمین!! (۱)

---

(۱) یہ مضمون ڈاکٹر مشیر الحق ندوی مرحوم سے متعلق کتاب سے ماخوذ ہے جو ان کے بھانجہ شاہ عبدالسلام بحری آبادی مرحوم (سابق استاد شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی وسابق ڈائرکٹر رضا لائبریری رام پور) کی مرتب کردہ ہے۔ (مرتب)

(۳)

مختصرانہ کامیاب زندگی

مشیر صاحب ایک طالع ارجمند لے کر دنیا میں آئے تھے۔ ترقی کی دوڑ میں اپنے ہم چشموں، ہم عمروں اور معاصرین سے آگے نکل گئے اور آگے ہی بڑھتے رہے۔ ایک اسلامی درس گاہ سے نکل کر جامعہ ملیہ آئے، اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں، زینہ بہ زینہ بڑھتے رہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وائس چانسلر کے درجہ تک پہنچ گئے۔ ان کی کرسی اونچی سے اونچی ہوتی گئی۔ بے ضرر، خلیق، ملنسار رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ اپنے آگے بڑھنے کے لیے انھوں نے کسی کو دھکا نہیں دیا، کسی کا حق نہیں مارا، متوازن رفتار سے جدوجہد کی خطِ مستقیم پر چلتے رہے۔ کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنائے گئے تو جس نے بھی سنا یہی کہا کہ موزوں جگہ کے لیے موزوں ترین شخصیت کا انتخاب ہوا۔ جامعہ ملّیہ کے حلقوں میں ہر دلعزیز تھے۔ کشمیر میں بھی ہر دلعزیز رہے۔

دینے والے کی نعمتوں کا کیا ٹھکانہ۔ ایک کاسۂ گدائی پُر ہوا تو دوسری زنبیل تھما دی۔ ان کی ترقیاں سب نے دیکھیں تھیں۔ آخرت کی نعمتوں کا کس کو اندازہ ہو سکتا تھا مگر دنیا کو یہ بھی دکھا دیا گیا کہ وقتِ موعود آیا تو خالی ہاتھ نہیں گئے، اپنی مظلومیت اور بے گناہی کا پروانہ ساتھ لے کر گئے، قسمت کی یاوری ہو تو ایسی ہو۔ پروفیسر مشیر الحق شہید بن جائیں گے، کون سوچ سکتا ہے۔

ایک پابند صوم وصلوٰۃ شریف النفس انسان کو کشمیری مار ڈالیں گے۔ اور حکومت ہند جو چند ہی روز پہلے ایک خاتون طالبِ علم کے لیے پانچ قیدیوں کو نہ صرف رہا کر سکتی ہے بلکہ یرغمال رکھنے والوں کی ہر ضد پوری کر سکتی ہے، وہ ایک وائس چانسلر کی جان بچانے کے لیے

ایک قیدی کا فدیہ نہیں دے گی؟ جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے، اس کی تصدیق ہو گئی۔

....

۱۶؍ اپریل ۱۹۹۰ء کو مکہ مکرمہ میں گیارہواں روزہ تھا۔ شام کو دہلی سے ایک فون آیا کہ مشیر الحق صاحب کو 'کڈ نیپ' کر لیا گیا ہے۔ دل و دماغ پر ایک دھچکا تو لگا کہ نہ معلوم اس ناگہانی بلا میں گرفتار، ذکی الحس، شریف انسان پر کیا گزری ہو گی مگر آنے والی مصیبت کا اندازہ نہ تھا۔ خیال ہوا کہ یہ ایک ڈرامہ ہے جو جلد ہی ختم ہو جائے گا۔ وزیرِ داخلہ اپنے سینے میں باپ کا دل رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان کے خاندان پر کیسی بجلی گری تھی جب ان کی صاحبزادی ان کے خاندان کے افراد سے چند روز کے لیے مخفی ہو گئی تھیں۔ اس وقت چند روز اخباروں میں گہما گہمی رہی پھر دوردرشن کے تماشائیوں نے دیکھا کہ وزیر داخلہ اپنے آقا (وزیر اعظم) کے حضور لڈووں بھرا تھال لیے استادہ ہیں۔

مگر سیاست کی بازی گری کو ہمارے جیسے عوام کیا سمجھیں، ہم تو وہی جانتے ہیں جو اخبارات میں پڑھتے ہیں، اور وہی سنتے ہیں جو ہمیں سنایا جاتا ہے۔ مشیر صاحب کے معاملہ میں شاہانہ تیور اور ہی دیکھے گئے گھر گھر کی تلاشی ہوئی۔ تلاشی ہو رہی تھی یا انتقام لیا جا رہا تھا یہ واشنگٹن پوسٹ کا نمائندہ ہی کہہ سکتا ہے۔ (۱) ہماری جرأت کہاں جو زبان کھولیں۔

پھر دو ہی روز بعد فوجیوں سے بھری ہوئی وادی میں۔ ائیر پورٹ کی سڑک پر وائس چانسلر مشیر الحق اور ان کے محافظ کی لاشیں ایسے ''جن اور فرشتے'' لا کر ڈال جاتے ہیں جن کو ٹینکوں سے بھری ہوئی سڑک پر کوئی اور نہیں دیکھ سکا۔ اس غیبی ہاتھ کا پتہ ہم ناچیزوں کو کیا شاید وزیر عالی مقام کو بھی نہیں۔

اس کھیل میں تعین مراتب ہے ضروری — شاطر کی عنایت سے تو فرزیں، میں پیادہ
بے چارہ پیادہ تو ہے اک مہرۂ ناچیز — فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ

---

(۱) مظفر آباد سے واشنگٹن پوسٹ کے نمائندے کی رپورٹ ۱۴؍ اپریل ۱۹۹۰ء

۲۰؍اپریل کو میرے عزیز احمد ندیم (۱) نے جدہ سے فون پر بھرائی ہوئی آواز میں بتایا کہ ابھی ابھی بی بی سے نے اطلاع دی ہے کہ چچا مشیر کو شہید کر دیا گیا۔ ذہن کے پردے پر گزشتہ پچاس سال کی تاریخ کا ایک ایک نقشہ ابھر کر سامنے آنے لگا۔

۱۹۴۰ء میں میرا ندوہ میں داخلہ ہوا تھا۔ ہم جماعت طلبہ میں مجیب اللہ غازی پوری (اعظم گڑھ کے مدرسہ جامعۃ الرشاد کے مالک وموسّس) جو کئی مدرسوں سے ہو کر ندوہ میں داخل ہوئے تھے۔ ایک دو سال بعد وہ ایک نوخیز عمر کے طالب علم کو اپنے ساتھ رکھنے لگے کہ یہ میرے برادر خورد ہیں۔ ایک ہم جماعت رفیق درس کے برادر خورد کی حیثیت سے مشیر الحق صاحب کو پہلی بار جانا (بعد میں جب ندوہ سے فارغ ہو چکے، مشیر صاحب نے بتایا کہ حافظ مجیب اللہ ندوی سے ان کی قریب یا دور کی کوئی رشتہ داری نہ تھی۔ ان کی والدہ نے اپنے یتیم پسر کو ایک سن رسیدہ طالب علم کی نگرانی میں رکھے جانے کا یہ انتظام کیا تھا)۔

یہ تو یاد نہیں کہ مشیر صاحب نے ندوہ سے کون سی سند حاصل کی۔ البتہ ۱۹۴۴ء میں جب استاذ گرامی مولانا عبدالسلام قدوائیؒ نے ادارۂ تعلیماتِ اسلام قائم کیا تو ان کے معاونین میں ایک نوجوان رفیق مشیر صاحب بھی ہو گئے جو مولانا عبدالسلام صاحب کے جامعہ ملیہ منتقل ہو جانے کے بعد بھی عرصہ تک وہاں رہے اور ایک پرچہ، تعمیر، ادارہ کی طرف سے نکلتا تھا جس کے ایڈیٹروں میں مخدوم ومربی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہٗ اور مولانا قدوائیؒ کا نام ہوا کرتا تھا، اس کی انتظامی ذمہ داری مشیر صاحب کے ذمہ تھی بعد میں وہ تنہا اس کے ایڈیٹر، ناشر سب کچھ رہ گئے تھے، ادارہ تعلیمات اسلامی ہی کے زمانہ میں انھوں نے ہائی اسکول پاس کیا اور مانٹریال (کناڈا) سے الگ اسکالرشپ کے حصول میں کامیاب ہو گئے اور ہندوستان ہی سے متعلق کسی عنوان پر پی ایچ ڈی کیا۔ مانٹریال جانے سے پہلے وہ شیخ الجامعہ مجیب صاحب کے پی اے تھے۔ رسالہ 'آج کل' میں ان کا ایک

(۱) احمد ندیم صاحب پروفیسر محمد شبیر ندوی جو مضمون نگار کے خویش (داماد) ہیں۔ (م)

مضمون شائع ہوا تھا جس میں ان کا تعارف اسی حوالہ سے تھا۔

مانٹریال کناڈا سے واپس آ کر ان کو کیا عہدہ ملا۔ غالباً لکچرر ہوئے ہوں گے۔ ترقی کر کے وہ اسلامیات کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہو گئے۔ سنا تھا کہ جامعہ ملیہ کے آئندہ وائس چانسلر کے لیے ان کی طرف نگاہیں اٹھ رہی ہیں مگر قبل اس کے کہ اس وقت کے شیخ الجامعہ کا ٹرم پورا ہو کشمیر یونیورسٹی کے لیے وہ وائس چانسلر منتخب کر لیے گئے۔

....

مشیر صاحب عمر میں چھوٹے تھے مگر ان سے دوستانہ تعلقات مساویانہ درجہ کے اس وقت سے ہو گئے تھے جب وہ ادارۂ تعلیماتِ اسلام میں رفیق کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ شرافت ان کے چہرہ مہرے، انداز و ادا ملنے جلنے کے آداب، چھوٹے بڑے کے احترام سے ظاہر تھی۔ مجھے تفصیل تو نہیں معلوم مگر یہ یقین ہے کہ وہ ایک عالی خاندان اور بڑے حسب نسب کے فرد تھے۔ کیوں کہ امام شافعیؒ کے عربی میں دو شعر ہیں جن کا مطلب ہے کہ پردیس میں کوئی نہیں جانتا کہ تمہارا حسب نسب کیا ہے۔ مگر تمہارے اخلاق سے لوگ معلوم کر لیں گے کہ تم کس طبقہ کے فرد ہو۔ واقعہ یہ ہے مشیر صاحب کے متعلق مجھے یقین ہے وہ یقیناً عالی نسب اور بڑے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔

مشیر صاحب سے ہماری ملاقات بڑے طویل وقفوں کے بعد ہوا کرتی تھی۔ میں حجاز میں تھا وہ مانٹریال میں تھے، میں انگلستان میں تھا تو وہ شملہ میں تھے۔ ایک مرتبہ مکہ مکرمہ بھی آئے، عمرہ کیا۔ مجھے ان کی میزبانی کی مسرت حاصل ہوئی۔ پھر جب سے میں ندوہ سال میں کئی بار جانے لگا تو کسی نہ کسی بہانے ملاقات ہو جاتی۔ کلکتہ میں ایک سمینار میں ملاقات ہوئی۔ ایک مرتبہ ان کے شعبہ میں لکچر کی دعوت دی گئی جس کے وہ صدر نشیں تھے۔ وائس چانسلر بننے کے بعد بھی ایک مرتبہ لکھنؤ آئے۔ قدیم روش اور معیاری وضع داری میں سر مو فرق نہیں آیا تھا۔ جس طرح پہلے ملنے کے لیے آیا کرتے تھے

اسی طرح آئے۔ سادگی سچائی اور خلوص سے اس طرح ملے جیسے ابھی ادارہ تعلیماتِ اسلام امین آباد سے چلے آرہے ہیں۔ میں خط وکتابت میں کوتاہ اور رسمی باتوں سے بیگانہ تو نہیں ہوں مگر طبیعت مشکل سے مائل ہوتی ہے۔ مشیر صاحب سے جو تعلقات تھے اس کا تقاضا تھا کہ جیسے ہی سنا تھا کہ وہ کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے ہیں، مجھے مبارکباد کا تار دینا چاہیے تھا۔ کم از کم خط لکھتا۔ مجھے دونوں میں سے کسی بات کی توفیق نہیں حاصل ہوئی مگر جب اپنی قیام گاہ پر سامنا ہوا تو اس کوتاہی کا احساس ہوا۔ میں نے کہا مشیر صاحب آپ کے اعلیٰ عہدے کی خبر ملی ارادہ ہی کرتا رہ گیا کہ آپ کو مبارکباد کا خط لکھوں مگر آج کا کام کل پر ٹالنے کی بری عادت ایسی ہے کہ اب تک نہ لکھ سکا، آج آپ آگئے ہیں تو زبانی مبارکباد دیتا ہوں۔ مشیر صاحب اس کے جواب میں اپنی طبعی خوش مزاجی اور ایک انداز بے تکلفی میں کہنے لگے، ابھی اپنی مبارکباد اپنے پاس محفوظ رکھئے جب وہاں سے کامیاب واپس آجاؤں تو دیجئے گا۔ پوچھا، ایسا کیوں؟ کشمیر تو امن پسند جگہ ہے۔ کوئی لکھنؤ یونیورسٹی یا جامعہ ملیہ تو نہیں ہے۔ جہاں کے بارے میں سنا جاتا ہے کہ وہاں شورش زیادہ ہوتی ہے تعلیم کم۔ کہنے لگے جی نہیں کشمیر بھی کم نہیں ہے پھر انھوں نے ایک دو واقعے بتائے جس سے اندازہ ہوا کہ دانش کدوں کے بجائے شورش کدے ہر جگہ ہیں، تعجب ہے کہ ان کو مغربی تعلیم کا اثر کہا جاتا ہے، مگر ہم نے مغرب میں اس طرح کی شورش نہیں دیکھی...... خیر یہ تو علیحدہ موضوع ہے، مشیر صاحب نے جو کہا ابھی نہیں واپس آؤں گا تو مبارکباد دیجئے گا اس وقت کس کو وہم بھی تھا کہ کاتب تقدیر یہ الفاظ ان کی زبان سے ادا کرا رہا تھا جس کی حقیقت نہ بولنے والے کو معلوم تھی اور نہ سننے والے کو۔

۸۸ء کے موسمِ گرما میں اپنے خاندان کے ساتھ کشمیر میں کچھ دن گزارنے کے لیے گیا ہوا تھا یہ وہ زمانہ تھا جب المرتضیٰ کا ٹائپ شدہ نسخہ ترجمہ کے لیے میرے حوالے کیا گیا تھا اس کے لیے موزوں ترین جگہ چشمہ شاہی یا پہلگام سمجھ میں آئی۔ چنانچہ آٹھ دس

دن یہاں اور ایک ہفتہ وہاں رہے۔ مولوی فاروق میر واعظ کے خواہ مخواہ اصرار پر پہلگام سے وادی آنا پڑا۔ ان کی کوٹھی کے قریب ایک جھیل میں ہاؤس بوٹ لیا جس کا نام نیویارک ہاؤس بوٹ تھا میر واعظ صاحب کے علمی معاون مولوی سعید الرحمٰن شمس خصوصی کرم فرما تھے ان کے ذریعہ سے مشیر صاحب کو کہلایا کہ آپ سے ملنے کے لیے کہاں اور کب آؤں۔ ظاہر ہے مشیر صاحب اب وہ ادارۂ تعلیماتِ اسلام والے تو نہ تھے ان کے اوقات ہوں گے اور ہونا چاہیے اسی روز یونیورسٹی کا ایک فرستادہ آیا کہ وی سی صاحب ملنے کے لیے آرہے ہیں۔ مشیر صاحب اپنی کار سے اترے، تقریباً گھنٹہ بھر بیٹھے، دوسرے روز کھانے کی دعوت دے گئے۔ ان کی کوٹھی دیکھی۔ دروازے پر وردی پوش پہرہ دار دیکھے۔ کئی ہفتے کے بعد رستہ اور گوشتابہ روغن جوش کے بجائے معقول کھانا کھایا۔ شامی کباب ''چپاتی'' دھلی ماش کی دال۔ وہ رات اچھی گزری۔ مشیر صاحب میں نفاست اور ذوق کی کمی نہ تھی مگر نمائش اور ریاکاری بالکل نہ تھی۔ مجھے ہمیشہ ان سے مل کر ایک ایسا انس محسوس ہوتا جیسے اپنے کسی قریب ترین عزیز سے مل رہے ہیں انتہائی سادگی وسچائی کے ماحول میں یہ باتیں ہوتی رہیں۔ مجھے ایسا محسوس نہیں ہوا کہ مشیر صاحب بدل گئے ہیں، ان کے رکھ رکھاؤ میں فرق آگیا ہو۔

ان سے آخری ملاقات گزشتہ سال دہلی میں ہوئی۔ مرحوم سید صباح الدین عبدالرحمٰن پر ایک سمینار جس کے وہ صدر تھے اور میں ایک مقالہ نگار کی حیثیت سے شریک تھا۔ مشیر صاحب نے اپنی تقریر میں کہا مجھ میں اور سید صباح الدین صاحب میں تضاد کی نسبت ہے۔ میں مدرسہ سے نکل کر یونیورسٹی کی بڑی پوسٹ پر پہنچا اور سید صباح الدین صاحب انگریزی درس گاہ سے نکل کر ایک اسلامی ادارہ کے سربراہ ہوئے۔ بات دلچسپ تھی اور سچی بھی۔

مشیر صاحب سے میری ملاقات تسلسل کے ساتھ نہیں ہوتی تھی۔ خط وکتابت تو بہت ہی کم ہوئی مگر ایک دوسرے کے لیے اجنبی اور بیگانہ کبھی نہ ہوئے۔ ان کی ایک اہم

خصوصیت جس کی میری نظر میں بڑی عزت ہے وہ یہ ہے کہ میں نے کسی کو ان سے شکوہ سنج نہیں پایا اور نہ ان کی زبان سے کسی کی برائی سنی وہ تعلقات بنانا جانتے تھے، دوستوں کا تعاون کرنے میں کوتاہ نہ تھے۔

بہر حال ان کا وقت موعود آیا۔ دنیا سے کامیاب ہو گئے۔ آخرت کے لیے پروانۂ مظلومیت لے کر گئے جو ان کی بخشائش کی ان شاء اللہ ضمانت ہے۔ مختصر اور کامیاب زندگی طویل اور بے کار زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

لیکن ان کا خون سیاسی بازی گروں کی موٹی گردن پر ہے اور رہے گا۔(۱)

---

(۱) ماہنامہ ذکر و فکر ''نئی دہلی''، شمارہ ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ جون ۱۹۹۰ء۔